Tarseel, Vol. 17 (ISSN: 0975-6655)
A Peer Reviewed Research Journal of Urdu
(Listed in UGC-CARE)
Directorate of Distance Education
University of Kashmir

قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں قومی یکجہتی و مشترکہ تہذیبی عناصر کا اجمالی جائزہ

ڈاکٹر حسینہ خانم (علیگ)

تلخیص

اردو ادب میں جس قدر ہندوستان کے مشترکہ تہذیب اور یہاں کی قومی یکجہتی کی ترجمانی ہوئی ہے، کسی دوسری زبان میں تخلیق شدہ ادب اس کی ہمسری نہیں کرسکتا ہے۔ اردو ادب سے وابستہ اگرچہ کم وبیش ہر تخلیق کار کا یہ امتیاز رہا ہے کہ انہوں نے ہندوستان کی صدیوں سے قائم تہذیبی وثقافتی روایت کی رنگینیوں کی خاکہ کشی بڑے فن کارانہ اسلوب میں پیش کی ہے لیکن بعض تخلیق کار ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنی پوری زندگی اور پورا ادبی سرمایہ اسی تہذیب و ثقافت، اس کی انفرادیت، مقبولیت، خصوصیات وامتیازات وغیرہ کی ترجمانی کے لیے مختص کیے ہیں۔ ان تخلیق کاروں میں ایک اہم اور سرِ فہرست نام "قرۃ العین حیدر" کا ہے۔ حیدر اردو کی ادبی تاریخ میں اپنا ایک الگ مقام ومرتبہ رکھتی ہیں۔ ان کی تخلیقات ہندوستان کی تاریخ و تہذیب کا زندہ جاوید مرقع ہیں۔ اس مقالے میں موصوفہ کے ناولوں میں قومی یکجہتی اور مشترکہ تہذیبی عناصر کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

کلیدی الفاظ:

تعلق داری نظام، فیوڈل سماج، جاگیردارانہ نظام، گنگا جمنی تہذیب، کنیادان، قومی یکجہتی، موریہ سلطنت، بھگت، بھجن، بھگتی تحریک

قرۃ العین حیدر نے اپنے ناولوں میں تاریخی تناظر کے پس پردہ قومی یکجہتی و مشترکہ تہذیبی عناصر کی پیش کش پر زیادہ توجہ دی ہے اور ان ہی عناصر سے فائدہ اُٹھا کر عینی نے برصغیر کی غلامی، المناک صورتحال اور بعد کی زندگی میں رونما ہونے والے تغیرات کی فضا سے اپنے ناولوں کے لیے مواد اخذ کیا ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں تاریخی پس منظر کے ذریعہ ان روایات، شکست وریخت کا شکار ہونے والی اس مشترکہ تہذیب اور ہندو مسلم اتفاق واتحاد کو تاریخی عناصر کے ذریعے بہت خوبصورتی اور ناول کے تمام تر لوازمات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ہندوستانی تاریخ، مشترکہ تہذیب اور قومی یکجہتی کے عناصر نے ان کے ناولوں کو ایک ''نئی جہت'' سے روشناس کروایا۔ ''میرے بھی صنم خانے'' عینی کا پہلا ناول ہے۔ دسمبر ۱۹۴۷ء میں منظر عام پر آ کر شہرت سمیٹنے والا یہ ناول لکھنؤ اور فیض آباد کے گردونواح کے علاقوں کی تہذیب و تاریخ کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ ناول تقسیم سے پہلے اور تقسیم میں فسادات کے دوران کی صورتحال اور ہندوستان میں قومی یکجہتی اور مشترکہ تہذیبی اقدار کے بکھراؤ اور انتشار کو تاریخی تناظر میں پیش کرتا ہے۔

''میرے بھی صنم خانے'' تاریخ اور تہذیب کے گہوارے سے جنم لیتا تقسیم ہند کے المیے پر ختم ہوتا ہوا ''زوالِ آدم خاکی'' کی کہانی بیان کرتا ہے۔ تعلقہ داری نظام کے خاتمے سے فیوڈل سماج کے رشتوں اور قدروں پر فسادات اور ہجرت کے سبب جو کاری ضرب لگی تھی اس نظام کے ٹوٹنے بکھرنے کا احساس عینی کے رگ و پے سرایت کر گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تقریباً تمام ناولوں میں، ہمیں ہجرت کا درد اور تقسیم وطن کے نتیجے میں انسانوں کا بے دریغ قتلِ عام اور دم توڑتی ہوئی انسانیت اپنی آخری ہچکی لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ جہاں تک بات ''میرے بھی صنم خانے'' کی ہے تو انھوں نے اپنے اس صنم خانے کے سارے ہی صنم بہت ریاضت و مشقت سے تراشا ہے۔ میرے بھی صنم خانے میں نظر آنے والی زندگی اس جاگیردارانہ نظام کی ہے جو آہستہ آہستہ نئے صنعتی نظام کی طرف پیش قدمی کر رہا ہے۔ انگریزی تعلیم و تمدن اور انگریزی تہذیب کو ستائشی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اس عمل نے ہندوستان کی قدیم رسوم و روایات کو فرسودہ قرار دے کر انھیں زندگی سے برطرف کر دیا۔ زمینداری کا جب خاتمہ ہوتا ہے تو عینی کو یہ خاتمہ صرف زمینداری کا خاتمہ نہیں بلکہ تہذیبِ انسانی کا خاتمہ محسوس ہوتا ہے اور ایک گنگا جمنی خوبصورت مشترکہ تہذیب کا تصور چکنا چور ہو کر بکھر جاتا ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے اپنے مضمون ''قوموں کا تہذیبی تشخص'' میں عینی کے اس احساس کو اس طرح قلم بند کیا ہے:

''عہد شباب کے ان خوابگوں اور گلفشاں محلات سے ۱۹۵۰ء کے بعد جب باہر نکلتی ہیں۔ تقسیم

وطن، فسادات، ہجرت کے المناک سانحے جب زندگی کی تلخ اور سنگین حقیقتوں کو روبرو لاتے ہیں اور جب ایک ملی جلی خوبصورت تہذیب کا تصور چکنا چور ہو جاتا ہے اور اودھ کی شام پر اندھیرے پڑاؤ ڈالتے ہیں تو قرۃ العین حیدر انسانی حیات اور اجتماعی حقیقتوں کے تئیں ایک سنجیدہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ اب وہ زندگی کے تغیرات کو تاریخ کے وسیع تناظر میں دیکھنے کی سعی کرتی ہیں۔'' [۱]

''میرے بھی صنم خانے'' میں عینی جس صنم خانے کا ذکر کرتی ہیں وہ ایک طرف مشترکہ تہذیب وتمدن کے صنم خانے ہیں تو دوسری طرف قومی یکجہتی اور اخلاقی اقدار کے نمائندے۔ یہ ناول اودھ کے جاگیرداروں کے زوال کو پیش کرتا ہے جس میں کرواہاراج غفران منزل کے کنور عرفان علی اور ان کے بچے پولو پیچو اور رخشندہ اور ان کے دوستوں کرن، کرسٹابل، حفیظ احمد، فیروز، گنی گول، سلیم، انور اعظم، ڈائمنڈ وغیرہ کے ڈرائنگ روم کے مباحثوں، نیوایرا کے مضامین، ڈنر پارٹیوں، پکنکوں اور آؤٹنگز سے گزرتا ہوا برصغیر کی تقسیم کے ساتھ جاگیردارانہ نظام کے خاتمے پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مصور اوشیر لہری، اور امبر پور ہاؤس کے انور اعظم، ماناٹھیر اور سندیلے بھی اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ اُبھرتے ہیں اور پھر اپنی ضیا کھو دیتے ہیں۔

عینی نے اس ناول میں ہندو، مسلم، عیسائی اور دوسرے بہتیرے کرداروں، ان کے خاندان اور زمان ومکان کا فسانۂ حیات مرتب کیا ہے۔ تقسیم ہند کے سانحے اور دوسری عالمی جنگ کے واقعات نے ان سب کے صنم خانوں کو پاش پاش کر کے بکھیر دیا ہے۔ جب کہ اس سے پہلے جنگ آزادی، اور برطانیہ کے دور اقتدار میں زندگی کے تمام ہنگاموں کے درمیان خوابوں کی ایک خوبصورت دُنیا آباد تھی۔ گومتی ندی کے کنارے سرسبز پُر فضا مقام پر واقع لکھنؤ اپنی گنگا جمنی تہذیب کی دلفریبی کا بھرم رکھے ہوئے تھا۔ ہندو مسلم اتحاد کے خوبصورت کینوس کا بکھر کر ہندوستان کو اپنے تعصبی رنگ میں رنگ لینا ہے۔ دنیا کے نقشے پر پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد ڈائمنڈ کا پاکستان چلے جانا لیکن رخشندہ کا اپنی سرزمین سے لپٹے رہنا اس قومی یکجہتی کے جذبے کو پیش کرتا ہے جہاں انسان وطن کی محبت میں جان تو دے سکتا ہے مگر فرار اختیار نہیں کر سکتا۔

جاگیردارانہ نظام کے کنور عرفان علی سلطنتِ برطانیہ کے دور میں اپنی تہذیب اور اودھ کے زوال پذیر تمدن کے امین تھے۔ غفران منزل اور اس کے کنور عرفان علی اسی تہذیب وقومی یکجہتی کے عناصر کے طور پر ناول کے ابتدائی حصے میں نظر آتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''اس لڑتی جھگڑتی خودغرض، کاروباری بورژوا دنیا میں سب سے الگ تھلک صرف اپنے طبقے کے مٹھی بھر افراد کے ساتھ وہ پرانی تہذیب، پرانی روایات کے ورثے کو لئے بیٹھے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مخالف ہوائیں بہت تیز ہیں۔ کہاں کی تہذیب اور کہاں کی وضع داری۔ یہ چراغ جو دو قوموں کے ثقافتی سنگم، تمدنی ہم آہنگی کو صدیوں سے روشن کر رکھا ہے۔ کوئی دم میں بجھا چاہتا ہے۔ لیکن اس چراغ کی مدھم روشنی نے ان رنگ محلوں میں جو دھندلا سا اُجالا بکھیر رکھا تھا۔ وہی بہت بڑا جذباتی سہارا تھا۔'' ۲

گومتی ندی گنگا جمنی مشترکہ تہذیب وقومی یکجہتی کی گواہ اور علامت بھی ہے۔ پچھوا ہوا کا دھیرے دھیرے چلنا، مغربی تہذیب وتمدن کے اثرات کا ہندوستان کی قدیم تہذیب پر دھیرے دھیرے اثر انداز ہونا ہے۔ لڑکیوں کے آنچل، قدیم مشرقی تہذیب کے مضبوط سائبان ہیں جن سے گزر کر آگے بڑھنا ابھی ان ہواؤں کے بس کا نہیں ہے۔ لہٰذا مغربیت پوری طرح مشرقیت پر حاوی نہیں ہوسکی ہے۔ ناول کے پہلے حصہ ''چلی جائے موری نیا کنارے کنارے'' میں پیش کیا گیا پورا ماحول، ندی، ہوا، چراغ اور آنچل مشترکہ تہذیبی عناصر ہیں۔ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب وقومی یکجہتی کی ایک خوبصورت مثال ''ڈاکٹر لینا دینا کر'' کا کنور عرفان علی کی صاحبزادی رخشندہ کو بیٹی بنا کر اس کا کنیادان کرنا ہے۔ ڈاکٹر لینا دینا کر رخشندہ کو کنیادان کے طور پر اسے ڈھیر سارا سامان دینا چاہتے ہیں تو یہ سامان نہیں بلکہ ان کی وہ بے لوث بے تحاشا محبت ہے جو کنیادان کی صورت میں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے۔

لالہ اقبال نرائن حویلی کا منشی، کائستھ ہے۔ مگر اس کا نام ہندو اور مسلمان کے دو ناموں سے مل کر بنا ہے بلکہ 'اقبال' اور 'نرائن' آپس میں اس طرح پیوست ہیں کہ ایک کے بغیر دوسرے کا وجود ممکن نہیں ہے۔ یہی حال قدیم ہندوستان میں ہندو اور مسلم کے درمیان قائم محبت اور الفت کا تھا۔ دیوالی میں لالہ کی نگرانی میں کروا ہاراج کی حویلی کو دلہن بنانا اور اس کے مکینوں کا دیوالی منانا اور لالہ کا محرم کے عاشورہ کی تعزیہ داری کرنا غرض یہ تمام بنیادی قومی یکجہتی اور مشترکہ تہذیبی عناصر ہیں۔ ہندو مسلم محبت واخوت کا اتنا خوبصورت امتزاج اور کسی ملک میں دیکھنے کو نہیں ملتا جو ہند کی سرزمین کا خاصہ ہے۔ قدیم ہندوستان کی تہذیب اس بات کی گواہ تھی کہ ہندو کو مسلم پر اور مسلمانوں کو ہندو پر کوئی فوقیت نہیں تھی۔ یہاں سب ایک دوسرے کو برابری کا درجہ دیتے تھے اور ایک دوسرے کی قدر کرتے تھے۔

علی گنج میں سال میں ایک بار قدیم ہنومان مندر میں میلہ لگتا ہے۔علی گنج مسلم اکثریت والے علاقے کی طرف اشارہ کرتا ہے اور وہاں پر ہنومان کے اتنے بڑے مندر کا ہونا مشترکہ محبت وو راثت کی نشاندہی کرتا ہے۔مئی کے مہینے میں پانی کی شدّت کی وجہ سے کرشن نرائن کول کے آئی سی ایس کی کوٹھی کے باہر ٹھنڈے شربت کی سبیل، پوجا کی غرض سے آنے والے بھگتوں اور ہندوؤں کے لئے لگائی گئی تھی کہ انھیں شدید گرمی میں ٹھنڈا شربت مہیا کرایا جا سکے۔قومی یکجہتی اس وقت کے انسانوں کے لہو میں سرایت کیے ہوئے تھی۔ یہاں مذہب صرف کرشن نرائن کول کا نہیں ہے بلکہ یہ انسانیت کا مذہب ہے جس کی پوجا ایک طرف کرشن نرائن کول کرتے ہیں تو دوسری طرف کنور عرفان علی بھی اس عبادت میں مصروف نظر آتے ہیں۔اتنی ایمانداری اور خلوص سے یہ عبادت کی جاتی ہے کہ اس کے لیے یہ رئیس لوگ اپنے تفریحی پروگراموں کو مسترد کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔

علی گنج حضرت علی کے نام پر بسایا گیا تھا جہاں بجرنگ بلی ہنومان جی کے اتنے بڑے مندر کی بنیاد رکھی گئی۔نواب واجد علی شاہ کے زمانے میں یہاں برہمنوں کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔عینی نے لکھنؤ میں علی گنج اور ہنومان مندر کو تاریخی عناصر کے طور پر پیش کر کے لکھنؤ کے نوابین کی ہندو مذہب اور تہذیبی وراثت سے سینکڑوں سال پرانی اس محبت کی داستان بیان کی ہے جس کی جڑیں متحدہ ہندوستان کی بنیادوں میں پیپل کے قدیم درخت کی طرح دور تک پھیلتی چلی گئی ہیں۔ جہاں مذہب کے نام پر تعصب کے رونگٹے کھڑے کر دینے والا بھجن نہیں بلکہ محبت کے سازوں میں لپٹے وہ ترانے سنائی دیتے ہیں جس سے جسم اور روح دونوں کو طمانیت وسکون کا احساس ہوتا ہے اور ہندو مسلم برادری ایک دوسرے کے مذہب کو عزت واحترام کے ساتھ اپنے سینے سے لگائے ہوئے نظر آتی ہے۔

عینی کا دوسرا ناول ''سفینۂ غمِ دل'' (۱۹۵۲ء) بھی لکھنؤ اور اس کے اطراف کے انھیں شہروں اور تعلقوں کے روبہ زوال ہونے کی داستان اور اسی ماحول کی پیش کش پر مبنی ہے۔

یہ ناول اپنے سینے میں سینکڑوں برس کی مشترکہ تہذیب اور قومی یکجہتی کے ٹوٹنے بکھرنے کے سانحے اور تقسیم ہند سے پیدا ہونے والے فسادات کے المیے کو اپنے اوراق پریشاں میں سمیٹے ہوئے ہے۔تھیم کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ ناول ''میرے بھی صنم خانے'' کی توسیع ہے۔

لکھنؤ، قیصر باغ، دلکشا کلب، محمد باغ کلب، از بلا تھوبرن کالج، فیض آباد روڈ، کنکر کا کنواں، بنارس، سارناتھ اور دہرہ دون کے ساتھ ساتھ، گنگا، گوداوری، پدما، رسپنا وغیرہ ندیوں اور مقامات کی تہذیبی وتاریخی اہمیت کے اعتبار سے یہ ناول تاریخی

پس منظر میں ہندستانی مشترکہ تہذیب اور قومی یکجہتی کی قدروں کے مدوجزر کا ایک سفر معلوم ہوتا ہے۔

اس ناول کی کہانی ۱۹۴۷ء سے پہلے کے لکھنؤ اور اس میں سانس لینے والے جاگیردارانہ ماحول اور اونچے طبقے کی طرزِ زندگی سے شروع ہوتی ہے۔ جہاں عیش و آرام کی زندگی گزارنے والے اعلیٰ طبقے کے افراد اور ان کی نوجوان نسل جس کی رگوں میں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب لہو بن کر دوڑ رہی ہے جو مختلف قوم اور مذہب کے ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے لیے خون کے رشتوں سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔اس دور کا لکھنؤ ہندو مسلم اتحاد اور مشترکہ تہذیب کی خوبصورت مثال پیش کرتا ہے۔اقتباس دیکھیں:

> ''ہوا صبح کی دھندلی چاندنی میں چاندی کی سی ٹھنڈی لو کی طرح دہک رہی تھی۔ شدھ، سناتن دھرم ہندوؤں کے بازار، مسلمان جولاہوں کے محلے، انگریز حکام کی کوٹھیاں، دریا کے پرے ان سب پر صبح کی کاسنی دھند چھائی ہوئی تھی۔ یونیورسٹی کی طویل عمارت، سارناتھ کا ابدی سکوت جونپور اور قنوج کے تیز سرخ گلابوں کے تختے، آم کے باغات۔.....یہ منظر ابدی ہے اور لازوال۔.....''[۳]

۱۹۴۷ء کے پہلے کا یہ وہ ہندوستان ہے جو لکھنؤ اور بنارس میں یکساں طور پر دھڑکتا ہے۔ وہ عظیم ہندوستان جو غلام ہوتے ہوئے ہندو مسلم ایکتا کی پاسداری میں ایک دوسرے کے شانہ بہ شانہ ساتھ چلتا ہے۔ جہاں مذہب و ملت کی کوئی تفریق نہیں جہاں ہندوؤں کے بازار اور غریب مسلمانوں کے محلے آباد ہیں۔ سارناتھ کے مندروں میں گونجتی گھنٹیوں کی آوازیں اور آرتی بھجن میں ڈوبا ہوا ماحول ایک طرف فضا کو پاکیزگی بخشتا ہے تو وہیں دوسری طرف مسجد میں اذان کی آواز لوگوں کے دلوں میں تقدیس پیدا کرتی ہے۔

کسی کو یہ احساس نہیں تھا کہ یہ سکون یہ محبتیں یہ چاہتیں اور ہندو مسلم یگانگت، اس طرح نفرت میں بدل جائیں گی۔ وہ دن بھی کبھی آئے گا جب بھجن اور اذان کی آواز پر تلواریں بے نیام ہو جائیں گی اور یہ منظر محبت کی چاشنی میں ڈوبے ہوئے رشتے جو خون کے رشتوں پر دسترس رکھتے تھے سب خاک و خون میں بہہ جائے گا۔

تقسیم ہندوستان کے بعد دو قومی نظریے کی بنیاد پر ہونے والے بٹوارے میں ہجرت کے سبب صدیوں پرانی مشترکہ تہذیب اور قومی یکجہتی کا شیرازہ بکھر گیا۔ وہ مشترکہ تہذیب جو ہندوستان کی شناخت قائم کرتی تھی جس کے سبب ہندوستان دنیا کے

تمام ممالک میں ایک اختصاص رکھتا تھا۔ وہ کسی ایک قوم کی جاگیر قرار دے دی گئی۔ تہذیب وتاریخ کے ٹوٹنے کا کرب عینی کی ہر تحریر (۱۹۴۷ء کے بعد) سے عیاں ہے۔ لکھنؤ، بنارس، سارناتھ کے مندر کاشی کے شوالے، مسلم محلوں میں ہندوؤں کے بازار یہ وہ تاریخی اور ثقافتی آثار ہیں جو اس ناول کے لیے خام مواد فراہم کرتے ہیں اور سفینۂ غم دل وجود میں آتا ہے۔ انسان جس کی انسانیت اسے ہر مذہب کا احترام کرنا سکھاتی ہے۔ ہندوستان کی تہذیب جہاں مندر، مسجد اور ہندو، مسلم میں کوئی بھید بھاؤ نہیں تھا۔ وہاں سازشوں کا حصہ بن کر رہ جاتا ہے۔

ناول ''سفینۂ غمِ دل'' لکھنؤ میں اعلیٰ طرز پر زندگی گزارنے والے راؤ بہادر مہیندر کمار راجونش اور ان کے بچے ارون راجونش اور میرا راجونش، نجم الدولہ ہاؤس کے مکین، بیگم نسیم احمد، ان کے بچے فواد نسیم احمد اور نادرہ نسیم احمد (راوی کا خاندان) ۔ جاگیردارانہ نظام کے پروردہ نواب قاسم رضا، انگریز آفیسر ایلم ریکسٹن اور معظم منزل کے افراد علی اور طلعت وغیرہ بہت سے کردار ہیں جو امیرانہ طرز پر عیش پرستی کی زندگی جیتے ہیں اور ساتھ ہی ہندوستانی قدروں کے محافظ اور امین بھی ہیں۔ عینی نے مختلف مذاہب کے لوگوں کا آپسی میل ملاپ، رہن سہن، ان کے اخلاقی اقدار اور سوچ سب کو احاطۂ تحریر میں لا کر مشترکہ ہندوستانی تہذیب اور قومی یکجہتی کے عناصر سے ''سفینۂ غم دل'' کا موضوع تیار کیا ہے۔ عبدالمغنی رقم طراز ہیں:

> ''اس داستان حیات کے چار اہم خاندانوں میں ایک مصنفہ کا بھی ہے۔ جب کہ یہ چاروں مل کر درحقیقت ایک مشترک ہندو مسلم عیسائی سماج یا مخلوط تہذیب کی تشکیل کرتے ہیں۔'' [۴]

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ناول میں پائے جانے والے ہندو مسلم، عیسائی کرداروں کے ذریعہ عینی نے قدیم تاریخ وتہذیب کے پس منظر میں ہندوستان کے اتحاد واتفاق کی دیوار میں پڑنے والی نفرت اور ناپسندیدگی کی دراڑ کو پیش کیا ہے۔ یہ ناول ہندو یا مسلم کرداروں ہی پر نہیں موقوف بلکہ عینی نے اس اتحاد کو تاریخی عناصر کی شمولیت کے ساتھ قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو صدیوں سے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا سرمایہ ہے۔

''سفینۂ غمِ دِل'' میں انھوں نے دہرہ دون، مسوری، اور لکھنؤ کے حوالے سے ہندوستان کے تمام خطوں میں ساتھ ساتھ رہنے بسنے والے ہندو مسلمان اور ان کے مخلوط کلچر کو تہذیبی وتاریخی عناصر کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ ارون کی زبانی اودھ کے کائستھوں کو آدھا مسلمان کہنا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس وقت ہندوستان کے اندر لوگ ایک دوسری قوم اور ان کے مذہب وملت کا کس قدر احترام کرتے تھے۔ اور اس احترام کے نتیجے میں ہندوستان کس قدر مضبوط ملک تھا۔ متحدہ ہندوستان

کا گنگا جمنی سرمایہ مخلوط کلچر، ماضی کی یادوں کا وہ عظیم ورثہ تھا جو تقسیم وطن کے وقت تک موجود تھا۔

ناول ''آگ کا دریا'' (۱۹۵۹ء)، موضوع کے اعتبار سے ابتدائی دونوں ناولوں ہی کی طرح تقسیم ہند کے پرسوز المیے کے بعد ہندوستانی تہذیب وثقافت کی پامالی کا دلدوز بیانیہ ہے۔ اس ناول کا کینوس ڈھائی ہزار سال پر محیط ہندوستان کی مشترکہ تہذیب اور قومی یکجہتی کے عناصر سے لبریز تاریخی پیمانہ ہے۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم سے جس نوع کے حالات اور واقعات سامنے آئے اور جس طرح تہذیب وثقافت کی شکست وریخت کا مسئلہ درپیش ہوا اس پر ڈھائی ہزار سال کی یہ تہذیب اور تاریخ سوالیہ نشان قائم کرتی ہے۔ ناول میں جہاں تاریخی عناصر کی کارفرمائی نظر آتی ہے وہیں قوموں کے عروج وزوال کی داستان بھی اپنا وجود رکھتی ہے۔

تاریخ کو پیش نظر رکھتے ہوئے تہذیبوں کی سیاسی اور سماجی اقدار وروایات کی زوال پذیری اور اس کی ازسرِنو بازیابی اور ساتھ ہی انسان کی انفرادی اور اجتماعی شناخت کو جس خصوصیت اور فن کارانہ بصیرت کے ساتھ پیش کیا ہے یہ ان ہی کا خاصہ ہے۔ ویدک زمانے سے ہندوستان کی آزادی تک کے تمام واقعات کو تسلسل کے ساتھ ایک لڑی میں پرونا اور اس کے تمام مثبت و منفی پہلوؤں سے بذات خود واقفیت حاصل کرنا اور حلقۂ قارئین کو اس کا احساس کرانا اپنے آپ میں ناقابلِ فراموش کارنامہ ہے۔

اس ناول میں ہندوستانی تاریخ، مشترکہ تہذیب، قومی یکجہتی، فلسفہ، رسم ورواج، عادات واطوار اور طرز معاشرت کو جس انداز سے پیش کیا ہے وہ اپنے آپ میں مکمل طور پر منفرد اور قابل ذکر ہے۔ ڈھائی پزار سال قبل ہندوستان کی جو صورتحال تھی یہاں کی تہذیب ومعاشرت، سماجی اقدار وروایات، تہذیبی حالات، لوگوں کا رہن سہن، بول چال، خورد ونوش، لباس و پوشاک اور ظاہری وضع قطع غرض کہ زندگی کے تمام پہلوؤں کو ناول نگار نے اپنی تخلیق میں پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کی عکاسی کرتے ہوئے حاکم وقت خصوصاً موریہ سلطنت کے نظام حکومت، شاہی رسم ورواج، شادی بیاہ کے طریقوں کا تذکرہ تہذیبی اور سماجی زندگی کے مدوجزر کی عمدہ تفصیل ہے۔

یوں تو اس ناول میں بنیادی طور پر وقت کو اہمیت دی گئی ہے۔ لیکن اس وقت کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی کے لیے عینی نے ہندوستان کی قدیم اقدار وروایات کے بیان کے ساتھ ساتھ جدید تہذیب ومعاشرت کا بھی سہارا لیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے مختلف فلسفوں، تصورات، خیالات اور بعض اہم فکری رجحانات ومیلانات کو جس انداز سے پیش کیا ہے اس سے ماضی

اور حال دونوں ہی ایک دوسرے کے بالمقابل نظر آتے ہیں اور ان میں ایک طرح کا تضاد بھی نظر آتا ہے۔ اس مقام پر ٹھہر کر ان خیالات اور تصورات کا بغور مطالعہ کرنے سے کچھ کھونے اور کچھ پانے کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وقت اور زمانے کے دروبست میں انسان نے اپنے قدیم سرمایے کو فراموش کر دیا ہے۔ اس کی جگہ جدید تہذیب و ثقافت کے ساتھ ساتھ نئے خیالات و تصورات نے لے لی ہے۔ اب جہاں تک منظر کشی اور جذبات نگاری کا سوال ہے تو یہ بھی تاریخ کے تابع ہیں اور اس ہنرمندی اور سلیقے سے پیش کیے گئے ہیں کہ تمام تہذیبی، تاریخی اور ثقافتی مناظر قاری کے روبرو نظر آتے ہیں۔ بطور مثال ناول کے پہلے دور کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں شراوستی شہر کا وہ منظر پیش کیا گیا ہے جس میں قدیم ہندوستانی تہذیب و ثقافت کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔

> ''بارہ مہینے چہل پہل رہتی، ہمیشہ کوئی نہ کوئی تہوار منایا جاتا، ہر شخص اپنے اپنے کام میں منہمک تھا۔ مصوروں اور سنگ تراشوں کی ٹولیاں نگار وخانوں میں مصروف رہتیں۔ نائیک اور نائکائیں زرق برق کپڑے پہنے، چہروں پر روغن لگائے مشہور تمثیلیں پیش کرتے ہیں۔ چوراہوں پر مداری اپنے کرتب دکھلاتے۔ بھنگ کی دکانوں پر آوارہ گردوں، اچکّوں، ٹھگوں کا مجمع رہتا۔ تہواروں کے موقع پر بنجارے تاڑی پی کر زور زور سے گاتے پھرتے۔ ڈوم نقلیں کرتے۔ ویش ناریاں چھن چھن کرتی اپنی گلیوں میں ٹہلتیں۔ امیر زادیاں سولہ سنگار کیے تھالیوں میں گھی کے چراغ جلائے مندروں کی اُور جاتی نظر آتیں۔ عود اور لوبان کی خوشبو سے فضا بوجھل ہو جاتی۔'' ۵

عینی نے اس ناول میں جو کردار پیش کیے ہیں ان کے حوالے سے بات کی جائے تو نسوانی کرداروں میں چمپک، چمپا بائی، چمپاوتی اور چمپا احمد خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ کردار زمانی بُعد کے ساتھ ساتھ نفع نقصان، ہجر و وصال، کرب و اطمینان اور کچھ کھونے و پانے کے جذبے سے ہمہ وقت دوچار ہوتے نظر آتے ہیں۔ دوسری جانب مرد کرداروں میں گوتم، گوتم نیلمبر اور گوتم دت بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ کردار انسانی فطرت کا مظہر بن کر سامنے آتے ہیں۔ ان کے علاوہ ناول میں ندی کو بھی ایک اہم کردار کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسا کردار ہے جو ہر دور میں نئی فضا اور منفرد رنگ و روپ کے ساتھ نمایاں ہوتا ہے۔

ناول کے پہلے دور میں ویدک کال کی تہذیب و ثقافت اور ہندوستان کی قدیم تاریخ کو پیش کیا گیا ہے۔ ان قدیم

تاریخی واقعات میں خصوصی طور پر چندر گپت موریہ کا عہد اور مہاتما بدھ کے افکار ونظریات کو مرکزیت حاصل ہے۔اس دور کے دومرکزی کردار' گوتم نیلمبر اور چمپا' ہر دور میں تہذیب وثقافت کا جیتا جاگتا نمانہ بن کر سامنے آتے ہیں۔اگر ان میں کوئی تبدیلی واقع ہوتی ہے تو صرف یہ کہ ان کے نام بدل دیے جاتے ہیں اس کے علاوہ ان کے عادات واطوار میں کوئی ردوبدل نہیں ہوتا۔

دوسرا دور ہندوستان کی نئی تہذیب کو پیش کرتا ہے۔اس دور میں جن کرداروں کو پیش کیا گیا ہے ان میں ابوالمنصور کمال الدین کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔اس کردار کے ذریعے مصنفہ نے عربی وعجمی تہذیب کے درمیان فرق کی وضاحت کرتے ہوئے ان کی پیچیدہ پرتوں کو وا کرنے کی کوشش کی ہے۔ابوالمنصور کمال الدین تصوف اور بھگتی تحریک سے بہت متاثر ہے۔فکر وفلسفہ،شجاعت واطاعت اور نئی تعلیم وتربیت کے حصول کے لیے ہمہ وقت سعی کرنا اس کی نمایاں خصوصیات ہیں۔بھگتی تحریک کے زیر سایہ ابوالمنصور کمال الدین کا کاشی سے بنگال تک کا سفر کرنا اور ایک شودر لڑکی سے شادی کرنا اور دوسری جانب چمپا کا وصال کے کرب اور زندگی کی محرومیوں سے شکست کھا کر گوشہ نشینی اختیار کرنے کا بیان ناول نگار نے نہایت موثر پیرائے میں کیا ہے۔

ناول کا تیسرا دور نوآبادیاتی دور کا عکاس ہے۔مسلمانوں کی ہندوستان آمد کے بعد یہاں کی قدیم تہذیب وثقافت میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں ان کا تفصیلی بیان اور مغلیہ دور کے ہندوستان کی جگمگاتی تصویریں اس دور میں اپنا وجود رکھتی ہیں۔اس حصے میں ناول نگار نے لکھنوی طرز معاشرت اور عیش وعشرت کی محفلوں کی عمدہ تصویر پیش کرتے ہوئے تمام تر جزئیات کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔اس حصے میں سرل الشیلے ،گوتم نیلمبر دت اور چمپا بائی مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔غور وفکر کے نئے دفتر اور نئے زاویوں کا ظہور ہوتا ہے۔اس کے علاوہ علم وہنر کا مرکز ہندوستان سے یورپ منتقل ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔علمی مرکز کے یورپ منتقل ہونے سے جہاں بہت سی تبدیلیاں دیکھنے کو ملتی ہیں وہیں قاری کے ذہن میں کچھ سوالات بھی پیدا ہوتے ہیں جن میں سب سے اہم سوال یہ ابھرتا ہے کہ آخر تخلیق کار نے کن وجوہات کی بنا پر یورپ کو مختلف علوم وفنون کا مرکز بنا دیا اور معاشرے کے بدلتے ہوئے رجحانات اور فکر وعمل کی تبدیلی نے کیوں کر ہندوستانی رسم ورواج، عادات واطوار اور تہذیب ومعاشرت کی بنیاد کمزور کر دی؟ اتنی قدیم اور مستحکم تہذیب وروایت کا شیرازہ کیوں کر بکھر گیا؟

مذکورہ بالا تینوں ادوار کے بعد ناول کے چوتھے اور آخری دور میں ناول نگار نے ہندوستان کی آزادی،تقسیم ملک کا پرسوز سانحہ اور ہجرت کے کرب کو موضوع بنایا ہے۔حکومت برطانیہ اور اس کے اہل کاروں نے اپنے دورِ اقتدار میں جس طرح کے اقدامات اٹھائے اور ہندوستان کو کمزور کرنے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی اور ملک کے اتحاد واتفاق کو پارہ پارہ کرنے کے لیے

انھوں نے جس طرح کی سازشیں کیں غرض ان سب کا افسانوی بیان اس حصے میں موجود ہے۔عینی نے اس حصے میں گنگا جمنی تہذیب کے مدوجزر، یہاں کی رواداری اور مشترکہ روایت کی داستان کو اس خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ یہ تمام تاریخی حقائق فن کے قالب میں ڈھل کر منصۂ شہود پر آجاتے ہیں۔ یہاں مصنفہ نے ہر قوم کی انفرادی اور اجتماعی تہذیب وثقافت اور حالات و واقعات کو بڑی فن کاری سے پیش کیا ہے۔

ناول کے اختتامیہ میں عینی نے تین ایسے خاندانوں کو مرکزیت دی ہے جن کا شمار شرفا میں ہوتا ہے اور وہ اپنی تہذیب و ثقافت، طرز معاشرت، رہن سہن، خورد ونوش غرض کہ اپنی شناخت کو باقی رکھنے کے لیے کی جانے والی تمام کاوشیں اور ملک کی تقسیم کے پرسوز سانحے کے زیر اثر رواداری کو قائم رکھنے کے لیے اٹھائے جانے والے اقدامات کا بیان ناول نگار نے جس تخلیقی صلاحیت اور فن کارانہ بصیرت کے ساتھ کیا ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ مذکورہ بالا تمام واقعات کے پس منظر میں ناول نگار نے ہندوستان کی قدیم تاریخ کو افسانوی قالب میں ڈھال کر کسی خاص نقطۂ نظر کی وضاحت کے طور پر پیش کیا ہے۔لہٰذا اگر اس امر کے تحت ناول کا تنقیدی مطالعہ کیا جائے تو اس ناول میں پیش کیے گئے تمام کرداروں کی حرکت وعمل اور آپسی کشمکش کو دیکھتے ہوئے ذہن میں ایک سوال اٹھتا ہے کہ ملک ہندوستان جو عہد ماضی میں ہر اعتبار سے مضبوط تھا، جہاں مختلف اقوام وقبائل کے مابین اس قدر اتحاد واتفاق تھا کہ اسے دنیا کے تمام ممالک کے سامنے بطور مثال پیش کیا جاسکتا تھا وہ ملک کیوں کر تقسیم ہوا؟ آخر کیوں یہاں کی تہذیب اور مختلف اقدار وروایات مجروح ہوتی چلی گئیں؟

عینی نے ڈھائی ہزار سالہ ہندوستانی تہذیب وتاریخ کے پس منظر میں جس تاریخی نکات پر بحث کی ہے وہ یہی وقت ہے جو اپنے اندر تخریب کے ساتھ ساتھ تعمیری عنصر بھی رکھتا ہے اور وقت کا پر جوش دریا جب اپنی روانی پر آتا ہے تو ہر شے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر مسخ شدہ حالت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ہندستان کی سیکڑوں برسوں کی مشترکہ تہذیب کے منتشر ہونے اور تقسیم ہند کے سانحے نے عینی کے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا اور ان کے ذہن میں کچھ سوال اٹھے کہ کیا بغیر تقسیم ہوئے غلام ہندوستان کو رہائی ملنے کی کوئی اور صورت نہیں تھی؟ کیا ہندوستان کی تقسیم اس کا مقدر تھی؟ ان سوالوں سے وہ بہت پریشان رہیں اور برسوں ان کے جواب تلاش کرتی رہیں۔اس سلسلے میں وہ خود کہتی ہیں:

> ''میرے سامنے سب سے بڑا مسئلہ Communication کا تھا۔ میں نے محبت، نفرت، مذہبی کٹرپن اور بے رحمی کے بارے میں بہت غور کیا انسان کی انسان کی جانب بے رحمی،

انفرادی اور اجتماعی طور پر بے رحمی کے ساتھ تقسیم کا مسئلہ پھر سامنے آ گیا کہ ملک تقسیم کیوں ہوا؟.....

اس سوال نے مجھے فلسفہ اور تاریخ کی طرف کھینچا اور اس کا جواب دینے کی کوشش میں میں نے ناول ''آگ کا دریا'' لکھا۔'' [۶]

بالآخر ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنے میں ہندوستانی کامیاب ہو گئے۔ مگر وہ اپنے ملک کو نہیں بچا سکے۔ وہ اتفاق و اتحاد، آپسی اخوت و محبت جس کی بدولت وہ یہ لڑائی جیت چکے تھے، جیت کے نشے میں ہندو مسلمان دونوں نے مل کر آزادی کی شکل میں جس سنہری کامیابی کو حاصل کیا تھا اب دونوں اس کا الگ الگ صلہ چاہتے تھے۔ ان تمام خون خرابے میں ہندوستانی تہذیب و تمدن کا بدترین نقصان ہوا۔ یہ انسانیت کی کتنی بڑی ٹریجڈی ہے کہ جہاں وہ پیدا ہوا۔ اس کے باپ، دادا، پرکھوں اور بزرگوں کی صدیوں پرانی زمین کو اس کے لیے اجنبیت کا لبادہ اوڑھا دیا جاتا ہے۔

ناول ''کارِ جہاں دراز ہے'' (۱۹۷۷ء) کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ قرۃ العین کی سوانح عمری ہے جسے انھوں نے ناول کے پیرائے میں پیش کیا ہے۔ لہٰذا اس صورت میں اسے Auto Biographical Fiction یا Non Fiction Novel بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس ناول میں انھوں نے واقعات کی پیش کش کے لیے جو انداز تحریر اختیار کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس قسم کے مختلف ناولوں کا مطالعہ کیا اور اس پیرائے اظہار کو برتنے کے لیے بہت دیدہ ریزی کی۔ لیکن ہندستانی مشترکہ تہذیب اور قومی یکجہتی کے ضمن میں اس ناول کے حوالے سے گفتگو کا کوئی خاص جواز نظر نہیں آتا۔

ناول ''آخر شب کے ہم سفر'' (۱۹۷۹ء)، عینی کے مذکورہ بالا ناولوں کے ماحول، مکان، علاقے، فضا اور پیشکش کے لحاظ سے ذرا مختلف ہے۔ پہلے کے تینوں ناول جو ۱۹۷۹ء سے پہلے تخلیق کیے گئے۔ ان میں ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کو یو پی اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں سے جوڑ کر دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہندوستان کی آزادی، برِّصغیر کی تقسیم اور اس کے سبب ہونے والی ہجرت کے نتیجے میں صدیوں پرانی مشترکہ تہذیب و تمدن کا بکھراؤ اور ان کے تاریخی اسباب نیز اس سے جنم لینے والا کرب و انتشار ان تینوں ناولوں کا موضوع ہے۔ جب کہ ان کے برعکس عینی نے ''آخر شب کے ہم سفر'' میں صرف ہندوستان کی تقسیم ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی تقسیم کے ساتھ ہی پاکستان کی تقسیم خصوصاً مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان میں ہونے والے تصادم کے سبب بنگلہ دیش کے وجود میں آنے کے تمام محرکات کو تاریخی پیش کش کے ذریعہ اقتصادی اور سیاسی پس منظر میں بنیاد بنا کر لکھا

ہے۔۱۹۴۲ء کا آندولن بنگال کی دہشت پسند انقلابی تحریک اور بنگلہ دیش وجود میں آنے کے تناظر میں لکھا گیا ناول ''آخر شب کے ہم سفر'' برصغیر کی تقسیم کے بعد قیام پاکستان اور پھر پاکستان کی تقسیم کے عمل میں بنگلہ دیش کے قیام کے پس منظر میں فسادات اور ہجرت کے اسی عمل کو پھر سے دہرایا گیا۔ان ہی تمام واقعات وسانحات کو عینی نے اس ناول میں تاریخی شکستوں کے حوالے سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس ناول میں بنگال کے تاریخی زوال کو ڈھاکہ کی مختلف حویلیوں اور بڑے خاندانوں کے ساتھ متوسط طبقے کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔چندر کنج کے ڈاکٹر بنوئے چندر سرکار،ان کی بیٹی دیپالی سرکار، بھائی دنیش سرکار، ارجمند منزل کے نواب فخر الزماں چودھری، نواب قمر الزماں چودھری، نواب نیر الزماں چودھری ، جہاں آرا اور ریحان کے ساتھ ووڈلینڈ کے بیرسٹر سر پری توش رائے ان کی بیوی اور بڑا لڑکا نرملیند ورائے، اور بیٹی اوما رائے اور اوما کے ماموں دھریندر موہن سین ڈی۔آئی۔جی اور للّی کاٹج کی روزی بنرجی، پادری بنرجی،اور ماں گری بالا بنرجی کے ذریعے سے عینی نے اس پورے ناول کے قضیے کو سمجھانا چاہا ہے اوران کے ساتھ ہی یاسمین مجید، ناصرہ نجم السحر اور بہت سے ضمنی کرداروں کے حوالے سے ماضی کے دریچوں سے دبیز پردے ہٹانے کی کوشش کی ہے۔ برصغیر کی تقسیم اوراس کے بعد پاکستان کی تقسیم سے ہوئے بے انتہا خسارے کو عینی نے محسوس کیا اورانھیں ان چاروں حویلیوں کے حوالے سے اپنے ناول کا موضوع بنایا۔

علی گڑھ اور ریحان الدین تاریخی عنصر کے ایک کردار کی حیثیت سے پورے پس منظر میں نظر آتے ہیں۔ ناول کا کردار نواب قمر الزماں چودھری سے لے کر نئی نسل ریحان اور دیپالی سرکار، یاسمین مجید اوراس کے آگے کی نسل ناصر نجم السحر تک سب کی جڑیں بنگال کی سرزمین میں پیوست ہیں۔تین نسلوں کی کہانی پر مشتمل، ناول کے کردار اپنے حرکت وعمل سے تاریخی و تہذیبی پس منظر کی روداد بیان کرتے نظر آتے ہیں۔اس ضمن میں ڈاکٹر نیلم فرزانہ کا قول توجہ طلب ہے:

> ''ریحان اور دیپالی ناول کے مرکزی کردار ہیں۔ جب کہ اومارائے ، روزی سانیال، جہاں آرا، یاسمین بلمونٹ، ناصرہ نجم السحر اور فرقان احمد وغیرہ ثانوی کردار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن کہانی کی بنت میں ان ضمنی کرداروں کی اہمیت کم نہیں ہے۔ بلکہ ناول کا ہر کردار منفرد اور مکمل داستان ہے جسے قرۃ العین حیدر نے بنگال کے مخصوص سیاسی اور تہذیبی پس منظر میں فنکارانہ اکائی عطا کی ہے۔'' [۷]

دیپالی سرکار دنیش سرکار کی بھتیجی ہے جنہیں ہندوستان کی آزادی کے لیے تحریک میں شامل ہونے کے جرم میں پھانسی کی سزا ملی۔ دیپالی سرکار کسی بھی قیمت پر ہندوستان کی آزادی کی خواہاں ہے۔ اسی لیے مجسٹریٹ کے بنگلے میں برطانوی حکومت کے اگلے اقدام کا پتہ لگانے کے لیے کلثوم کے فرضی نام سے آیا تک بننے سے گریز نہیں کرتی۔

۱۹۴۷ء کی وہ پہلی تحریک تھی جس میں ہندو، مسلمان اور عیسائی سبھی شانہ بشانہ ایک ساتھ ہو کر لڑ رہے تھے۔ دیپالی سرکار ایک تعلیم یافتہ خاتون ہے۔ اس کے والد قدیم زمیندار اور ڈاکٹر ہیں۔ ملک کی حفاظت اور حب الوطنی کے قومی جذبے کے تحت وہ آیا بن کر انگریزی سرکار کی مخبری میں کامیابی حاصل کرتی ہے۔ دیپالی کی اس قربانی سے ریحان اور اس کا گروہ ولیم کینٹ ویل کی دسترس سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ قومیت کا یہ جذبہ ہندوستان کو آزاد کرانے میں ہندو مسلم سکھ عیسائی سبھی کے دلوں میں یکساں طور پر جاگزیں ہے۔ ریحان اسی جذبے کے تحت اس تحریک میں کام کرتے ہوئے سالوں تک انڈر گراؤنڈ رہتے ہوئے بن باسیوں کی سی زندگی گزاری ہے۔ اسی ہندوستان کی خوش حالی اور امن کے لیے ہندوستانی ترنگے میں لگے نارنجی رنگ کے پیغام کی خاطر دیپالی کے چچا دنیش چندر سرکار نے اپنی جان کی قربانی دی۔ اور ان ہی کی طرح لاکھوں لوگوں نے بغیر مذہب وملت کی تفریق کیے ایک ساتھ آزادی کے لیے قربانیاں دیں۔ روزی بنرجی، سریندر مکرجی، اکشے دا، محمود الحق، کلپنا دت، پرتی لتا، سوریہ سین، شانتی دیو، کومیلا دیبی، ممتا دیبی اور کماری بینا داس وغیرہ نے جان و مال کی قربانیاں دیں۔ مردوں کے ساتھ عورتوں نے بھی اس تحریک میں قدم سے قدم ملا کر ساتھ دیا۔ یہ متحد، مشترک ہندوستان تھا جو ۱۹۴۷ء سے پہلے اپنی اسی گنگا جمنی تہذیب کے لیے ساری دنیا میں منفرد اور ممتاز مقام رکھتا تھا۔ جس کی آزادی کی تحریر ہندو مسلمان سکھ عیسائی بھائیوں نے مل کر اپنے خون سے رقم کی تھی۔ اقتباس دیکھیں:

> ''خودی رام باسو سے لے کر دیپالی کے چچا دنیش چندر سرکار کے زمانے تک ملک میں پھانسیوں کے سیاہ درختوں کا کتنا بھیانک جنگل کھڑ کھڑا رہا تھا۔ جس کے ایک طرف کالا پانی تھا اور دوسری طرف اونچے قید خانے۔'' ۸

شہادت کے بعد خودی رام کی شہرت بہت ہوئی اور وہ ہندو مسلمان دونوں کے دلوں میں گھر کر گئے۔ بنگال کے جولاہے ان کی شہادت سے اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے خودی رام بوس کے نام کی دھوتیاں بننا شروع کر دیں۔

یہ تصویر مشترکہ تہذیب اور قومی یکجہتی کی زندہ مثال ہے کہ ایک ہندو دہشت گرد کے مرنے پر جو درد ہندوؤں کے دل میں

ہواوہی کیفیت مسلمانوں نے بھی اپنے دلوں میں محسوس کی۔عینی نے خودی رام باسو کے تاریخی کردار کے ذریعے اس پورے عہد کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔اس قدیم ہندوستان کی تصویر کشی کی ہے جہاں ایک ہندو کے مرنے پر مسلمان اپنے گھروں میں چولہا نہیں جلاتے۔ یہ ہندو مسلمان کی آپس کی محبت ہے جہاں سب انگریزوں سے ہندوستان کو آزاد کرانے کے لیے متحد ہوکر تحریک چلاتے ہیں اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''اس زمانے میں ہندوستانی انقلابیوں نے برلن کمیٹی بنائی تھی۔جس میں سروجنی دیوی کے بھائی ویریندر چٹوپادھیائے،اور راجہ مہیندر پرتاپ اور بھوپندر ناتھ دت اور سوہن سنگھ اور برکت اللہ اور چمپک رمن پلّے اور ایم۔این رائے شامل تھے، بنگالی، پنجابی، مدراسی، ہندو، مسلمان، سکھ، کون کہتا ہے کہ ہندوستانی قوم متحد نہیں ہوسکتی---؟'' ۹

مشترکہ ہندوستان کی یہ محبت اور ہندو اور مسلمانوں کا ایک دوسرے پر اعتبار ہی ان کی سب سے بڑی طاقت تھی۔تقسیم در تقسیم کی ٹریجڈی زبان اور کلچر کے فرق سے رونما ہوئی۔کلچر اور زبان کے اس نفاق کو عینی نے تاریخ وتہذیب کی شکست وریخت کا ماحصل قرار دیا۔جس کے سبب بنگال کے تاریخی پس منظر میں تین سو سالہ پروان چڑھنے والی ہندو مسلم مشترکہ تہذیب انتشار کا شکار ہوگئی۔

ناول ''گردش رنگ چمن'' بھی ماضی کی بازیافت سے عبارت ہے اور ہندوستان کے عظیم تاریخی سانحے کے بعد نئے معاشرتی زوال، تباہی اور بربادی کی المناک داستان کو درد آمیز پر تاسف لہجے میں بیان کرتا ہے۔

یہ ناول تقریباً ایک صدی سے زائد عرصے کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔''گردش رنگ چمن'' کا منبع ومرکز بھی وہی اودھ کی مانوس سرزمین ہے۔ناول کے تمام واقعات لکھنؤ اور اس کے آس پاس کے شہروں، بارہ بنکی، دیوہ شریف اور دوسرے علاقوں جے پور، اجمیر اور کلکتہ وغیرہ کے اردگرد گھومتے نظر آتے ہیں۔''گردش رنگ چمن'' کا پس منظر برٹش کولونیل (Colonial) عہد سے شروع ہوکر ۸۴-۱۹۸۳ء تک کے طویل عرصے پر مشتمل ہے۔جس میں برطانوی دور حکومت میں وجود پذیر نئے ہندوستانی معاشرے اور تہذیب وثقافت کی تصویریں متحرک نظر آتی ہیں۔

عینی نے وقت اور تاریخ کے تناظر میں ہندوستان کے بدلتے ہوئے رنگ کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔قدیم ہندوستان اور اس کی مشترکہ تہذیب وتمدن، اس کی تاریخی، سیاسی، معاشی، معاشرتی اہمیت جو ہندوستان کی روایات کا اس کی مٹّی کا حصّہ تھی۔

جہاں انسان اور انسانیت، ذات پات، چھوا چھوت اور مذہبی فرقہ بندی سے اوپر اپنی ایک الگ پہچان رکھتا تھا۔ اس پورے ماحول کی تباہی، تاریخی واردات کا بیان دراصل گردش رنگ چمن ہے۔ ہندوستان ایک خوبصورت چمن تھا جہاں ہر رنگ اور نسل وقوم کے لوگ پوری آزادی سے ایک ساتھ مِل جُل کر اپنی زندگی گزارتے تھے اور ہر طرف شادابی وخوش حالی تھی محبت کی فراوانی تھی، حُسن تھا، بہار تھی۔ اس مرکب سے ایک خوبصورت ہندوستان کا وجود ہوا مگر تاریخ کی گردش نے ہندوستان کا رنگ بدل دیا۔ تاریخ کے بھنور میں پھنس کر سونے کی چڑیا کہا جانے والا ہندوستان اس دوراہے پر کھڑا ہو جاتا ہے جہاں ہر دوسرا شخص اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش میں مصروف ہے۔ یہ المیہ ایک تکلیف دہ یادداشت ہے جو نتیجے کے طور پر ''گردش رنگ چمن'' میں ایک سوال بن کر اُبھرتا ہے۔

> ''گردش رنگ چمن'' کا منظر نامہ برٹش کولونیل عہد ۱۹۸۳ء تک پھیلا ہے جس میں برطانوی عہد کے ہندوستانی معاشرے اور تہذیب کی رنگارنگ تصویریں پیش کی گئی ہیں۔ بالخصوص اس عہد کی طوائفوں کی شاندار مگر حسرت آمیز اور عبرت انگیز تصویر کشی قاری کو مسحور اور متاثر کرتی ہے ۔وہیں دل گرفتہ بھی کرتی ہے۔'' [۱۰]

عینی نے تاریخی عروج وزوال کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔ دلّی جس کے دِل میں ہندوستان کا دل دھڑکتا تھا انگریزوں نے اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ بہادر شاہ ظفر رنگون میں قید کسمپرسی کی زندگی گذارنے پر مجبور تھے۔ ہندوستانی باشندے اس کی روح سے محبت کرتے تھے۔ اپنی تہذیب، اپنی روایات، قدیم وضع داریاں اپنی جان سے بڑھ کر عزیز تھیں۔ غدر فرو ہونے کے پچاس ساٹھ سال بعد بھی لوگ اپنی تہذیب اور اپنی قدروں سے لپٹے رہے۔ اس المیہ کو عینی نے قصّہ کی شکل میں ''گردش رنگ چمن'' میں بیان کیا ہے۔ مہرو جو خود ایک مغل زادی ہے مگر حالات کی گردش نے اس سے اس کی پرانی شناخت چھین کر نئی شناخت ''طوائف'' بخش دی ہے۔ وہ اپنے بادشاہ اور بادشاہ زادوں کی حالتِ زار پر افسوس کرتی ہے۔ جبکہ ہونا تو یہ چاہیئے کہ وہ ان کی حالتِ زار پر کف افسوس ملنے اور ماتم کناں ہونے کے بجائے خوش ہوتی کیونکہ اس کی اپنی حالت خود قابلِ رحم تھی مگر وہ ایسا نہیں کرتی اور یہ صرف مہرالنساء ہی نہیں بلکہ نواب فاطمہ بیگم جن کے خون میں مغل اور ایرانی رنگ کی آمیزش ہے، سب کچھ تباہ وبرباد ہونے، زندگی کی بھیانک شکل دیکھنے کے باوجود بھی اپنے ملک اور اس تہذیب پر جان چھڑکتی ہے۔ عندلیب بانو بیگم کی زبانی نواب فاطمہ کی کہانی ملاحظہ فرمایئے:

''مما کہنے لگیں! میں جہاں پناہ کے مزار پر فاتحہ پڑھنے جاؤں گی۔ میں نے پوچھا کون جہاں پناہ؟ زور سے چلاّ ئیں: حضرت بہادر شاہ اور کون۔

''ایک روز اس معمولی سے چوبی دومنزلہ مکان کی زیارت کے لئے پہنچیں جہاں بادشاہ کو نظر بند رکھا گیا تھا۔ بولیں ہائے ہائے دکھیا کو دس روپئے روز خرچے کے لئے دیتے تھے حرامزدے۔ لعنت''----- میں سمجھ گئی انگریزوں کو گالی دے رہی ہیں۔''[۱۱]

اپنے ملک اور اپنی تہذیب سے محبت و وفاداری کی یہ وہ مثال ہے جو طوائفوں کے گروہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اپنے وطن اور مٹّی سے محبت بالکل فطری عمل ہے۔ مہر و اور نواب فاطمہ کے دِل میں ہندوستان کے لیے محبت، تہذیبی و تاریخی اثاثہ ہے جسے عینی نے ۱۸۵۷ء کے غدر کے تناظر میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ نسلیں جب بدلتی ہیں تو تہذیبی و تاریخی اعتبار سے ایک اور انقلاب برپا ہوتا ہے اور آنے والی نئی نسل اپنی موروثی تہذیب اور اس کی روایتوں سے روگردانی کرتی ہے۔

غدر میں ہوئے حادثے سے دونسلوں کے مابین ان کی فکر اور رویے میں جو انقلاب برپا ہوئے وہ ہندوستانی تہذیب کے عظیم سرمائے کے لیے سم قاتل ثابت ہوئے۔ آنے والی نئی نسل نے جب غدر کے بعد آنکھ کھولی تو اس کے سامنے ایک الگ قسم کی تہذیب پھل پھول رہی تھی جس میں انگریزیت سرایت کئے ہوئے تھی۔ خالص ہندوستانی مشرقی تہذیب کی جو تھوڑی بہت رمق اس وقت باقی تھی انھیں اس سے نہ کچھ خاص قسم کا لگاؤ محسوس ہوتا تھا اور نہ ہی دلچسپی تھی۔ ہندوستان میں انگریزوں کے تسلط کے زیر اثر تہذیب پر اس کے اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ جس کے تحت اینگلو انڈین سوسائٹی کی بنیاد پڑ رہی تھی۔ مگر اپنے ماضی کے لیے نوحہ کناں اگلے وقتوں کے قدیم لوگوں کا رویہ عندلیب بانو کے لیے پر تحیر تھا اور وہ یہ بھی محسوس کر رہی تھی کہ جو اس کے آگے کی یعنی تیسری نسل اس بات سے بے پرواہ تھی کہ مغل ایمپائر کون تھے اور غدر کس بلا کا نام ہے اسے ان سب چیزوں سے کوئی مطلب نہیں تھا۔

عینی ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کو ناولوں میں اہتمام کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔ ہندوستان کی سرزمین ہر قسم کے لوگوں کے لیے ہے جہاں صدیوں سے الگ الگ ذات اور مذاہب کے ماننے والے آپس میں اختلاط اور میل جول سے رہتے ایک دوسرے کے مذہب کو عزت اور قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جہاں مسلم اولیاء کی درگاہ پر بغیر کسی روک ٹوک کے غیر مسلم

کثیر تعداد میں آتے اور اپنا سَر جُھکاتے ہیں۔ بندگانِ دین کے دامن سے لپٹے ہوئے ہیں۔ یہاں آپس میں رنگ، نسل، قوم ، مذہب میں اتنے تضاد ہونے کے باوجود لوگ ایک دوسرے کا ادب اور احترام کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے لیے ان کی محبت کم نہیں ہوتی۔

ناول ''چاندنی بیگم'' (۱۹۹۰ء)، عینی کا آخری ناول ہے۔ تقسیم وطن کے مسائل اور پاکستان کے قیام کے بعد مغربی ومشرقی پاکستان میں علیحدگی سے پیدا شدہ فسادات اور ہجرت کے عمل کو پیش کرتا ہے۔ اپنے دیگر ناولوں کی طرح عینی نے ''چاندنی بیگم'' میں بھی تاریخی ادوار، کردار اور زمین کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔ اس ناول کی سرزمین بھی لکھنؤ کی وہی جانی پہچانی جگہ ہے جو ان کے دوسرے ناولوں میں ہمیں دیکھنے کو ملتی ہے۔ لکھنؤ کی مانوسیت سے معمور فضا میں عینی نے چاندنی بیگم کی تخلیق کی۔ ''چاندنی بیگم'' میں لکھنؤ کے ساتھ ساتھ بہرائچ، دہرہ دون، کلکتہ ٹالی گنج، ٹیپو سلطان بار اور ٹیپو سلطان شاہی مسجد وغیرہ تمام جزئیات کے ساتھ ناول میں نظر آتے ہیں۔

اس ناول کا قصہ چار خاندانوں کی زندگیوں پر محیط ہے۔ آزادی کے بعد پیدا ہونے والی اندوہناک صورت حال کو عینی نے ان خاندانوں کے حوالے سے پیش کیا ہے۔

چاندنی بیگم کی کہانی شیخ اظہر علی کے زمیندار گھرانے سے شروع ہوتی ہے۔ شیخ اظہر علی ایڈوکیٹ ان کی بیگم، بدرالنساء ، اظہر علی عرف بٹو باجی غریبوں اور معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے مشہور تھیں اور ان کا بیٹا قنبر علی اسٹوڈنٹ یونین لیڈر بن گیا۔ اس حویلی کے تینوں مکین پڑھے لکھے اور قابل تھے۔ اس کے علاوہ راجہ صاحب تین کٹوری ہاؤس کا خاندان، قصر شیریں مسز ڈھونڈھی کا خاندان اور علیمہ بانو، ان کی بیٹی چاندنی بیگم کا خاندان اس پورے ناول کا قضیہ بیان کرتا ہے۔ اس طرح ہندوستان کی آزادی اور پاکستان کے قیام پذیر ہونے سے معاشرے کے اعلیٰ اور متوسط طبقے کے ہونے والے نقصان کا اظہار اس ناول کا ماحصل ہے۔ دیگر ناولوں سے الگ یہ ناول اعلیٰ سوسائٹی سے قطع نظر ایک غریب خاندان ''چاندنی بیگم'' کے حوالے سے اس سیاسی اُتھل پُتھل کی تصویر کشی کرتا ہے۔ جہاں پڑھے لکھے متمول خاندانوں کے آدھے سے زیادہ افراد کے پاکستان چلے جانے سے باقی بچے افراد کی زندگیاں تباہ برباد ہوگئیں۔ ''گردش رنگ چمن'' میں جس طرح عینی نے ۱۹۴۷ء کے حوالے سے عورتوں کے بھیانک انجام پر روشنی ڈالی ہے۔ اسی طرح ''چاندنی بیگم'' میں بھی اس مسائل سے نبرد آزما ہونے والا عورتوں کا طبقہ اس کا موضوع ہے۔ صرف صورتحال ذرا مختلف ہے۔ اس کے علاوہ صنوبر فلم کمپنی کے اراکین، ماسٹر موگرا کا خاندان (ان کی بیگم چنبیلی

اور بیٹی بیلا رانی شوخ اوران کے بیٹے پریزادہ گلاب) ناول میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔

آزادی کے بعد چھیالیس سال کومحیط عرصۂ دراز کا پورا منظر نامہ ماضی بعید اور ماضی قریب کے حوالے سے عینی نے اس کے معاشی معاشرتی، صنعتی، اخلاقی، تبدیلیوں کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کا ہجرت کر جانا اور ہجرت نہ کرنے والوں کی تکلیفیں اور مصائب، لڑکیوں اور لڑکوں دونوں کے لیے شادی کا مسئلہ بھی اس ناول میں موضوع بحث ہے۔ ''نزہت سمیع الزماں'' اپنے مضمون ''چاندنی بیگم'' میں فرماتی ہیں :

> ''مصنفہ نے ہندوستان کی عصری تاریخ کے مختلف مسئلے کو نہایت فن کاری اور خوبصورتی سے اس ناول کی بنیاد بنایا ہے۔ اس کے ماضی قریب یعنی ۱۹۴۷ء سے لے کر اب تک کی معاشی، اور معاشرتی تبدیلیوں کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے۔ مثلاً متروکہ جائدادوں کا مسئلہ، ہندوستانی مسلمانوں کے عزیموں کا پاکستان جانا، یہاں رہ جانے والوں کی دُشواریاں، خاتمہ زمینداری سے پیدا ہونے والی مشکلات جس کی وجہ سے بعض زمینداروں کا ذہنی توازن بگڑ جانا، لڑکیوں کے لئے اچھے لڑکے نہ ملنا، شرفاء کے لڑکوں کا کمیونزم کی طرف جھکاؤ یعنی ترقی پسندی کا فیشن، مسلمان لڑکیوں کے زیادہ موڈرن نہ ہونے کی وجہ سے پڑھے لکھے مسلمان لڑکوں کا اپنے ساتھی ہندو لڑکیوں یا کمتر خاندان کی تیز طرار لڑکیوں سے شادی۔'' [۱۲]

مندرجہ بالا اقتباس ''چاندنی بیگم'' کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔ عینی نے قدیم مشرقی تہذیب پر جدید مغربی کلچر کے اثرات سے نئی تہذیب کا جنم اور قدیم وجدید کا امتزاج اور آپسی تصادم ناول کو نئی جہت عطا کرتے ہیں۔ ناول برطانوی کولونیل (نوآبادیاتی) عہد میں ہندوستان کے شہر لکھنؤ سے شروع ہوتا ہے۔ شیخ اظہر علی، نامور عزت دار، مشہور ومعروف وکیل ہیں۔ شیخ صاحب اوران کی بیگم قدیم تہذیب کی پروردہ ہیں اوراس کے ریت رواج اور قوانین کو اہمیت دیتے ہیں۔ جب کہ ان کے برعکس ان کا اکلوتا بیٹا قنبر علی ترقی پسند ذہن کا مالک ہے اور اشتراکی خیالات رکھتا ہے۔ حویلی کے اس طرف ندی کے کنارے پر دوسرا زمیندار گھرانا راجہ صاحب تین کٹوری ہاؤس کا ہے۔

حویلی میں غیر ارادی طور پر آگ لگتی ہے اور چاندنی کے ساتھ کوٹھی کے مکین بھی جل کر خاک ہو جاتے ہیں۔ اس بلائے ناگہانی میں قنبر علی، بیلا، چاندنی، منشی سوختہ کے ساتھ وہ عہد بھی جل کر خاک ہو گیا اور اس طرح ایک تہذیبی تاریخ کا خاتمہ ہو گیا۔

یہی وہ ہندو مسلم مشترکہ تہذیب ہے جو قرۃ العین حیدر کے یہاں شدت کے ساتھ موجود ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے ہندوستان کی تہذیب قدیم مشترکہ کلچر اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ ان کے ناول میں نظر آتے ہیں۔ جہاں بیلا کے کنویں میں کودنے والے حادثے کو لے کر حویلی کے سارے مکین قنبر علی کا ساتھ دیتے ہیں وہیں الحمدو کے جذبات قنبر علی کے لیے اپنی سگی ماں سے کم نہیں ہیں۔

چاندنی بیگم کی کہانی زمیندارانہ دور سے شروع ہو کر تقسیم وطن اور اس کے بعد بنگلہ دیش کا قیام اور اس کے بعد کے تیس چالیس برسوں کے طویل عرصے پر محیط ہے۔ شیخ اظہر علی کی کوٹھی کے احاطے میں پیپل کے درخت کے نیچے منشی بھوانی شنکر سوختہ کا پتھر رکھ کر پوجا پاٹھ کرنا اور دوسرے سرے پر بنی مسجد میں رمضانی اور عیدو کا نماز ادا کرنا یہ آپسی محبت اور یگانگت کی عکاسی کرتا ہے۔ جہاں ایک دوسرے کے مذہب کے سلسلے میں، ایک دوسرے کے لیے ان کے دل میں عزت و احترام اور بھائی چارے کا جذبہ ہے۔ لیکن اتفاقیہ طور پر ریڈ روز میں لگنے والی آگ سے بیلا، قنبر علی، چاندنی بیگم کے ساتھ منشی بھوانی شنکر سوختہ بھی جل کر راکھ ہو گئے۔

اس جائزے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ عینی نے آزادی کے حالات سے متاثر ہو کر اپنے ناولوں میں مشترکہ تہذیب اور قومی یکجہتی کے موضوع پر زیادہ فوکس کیا ہے۔

OOO

حواشی:

۱۔ چہار سو، قرۃ العین حیدر نمبر: جلد ۱۴، ۲۰۰۵ء ص: ۲۵، قبض الاسلام پرنٹنگ پریس، راولپنڈی

۲۔ قرۃ العین حیدر، میرے بھی صنم خانے، ص: ۳۹، ۲۰۰۷ء ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی۔ ۶

۳۔ قرۃ العین حیدر، سفینۂ غمِ دل، ص: ۱۰، ۲۰۱۳ء، عفیف پرنٹرس دہلی

۴۔ قرۃ العین حیدر کا فن، عبدالمغنی، ص: ۵۳، ۱۹۹۴ء ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

۵۔ قرۃ العین حیدر، آگ کا دریا، عفیف آفسیٹ پرنٹرس دہلی-۶، ۲۰۱۲ء، ص: ۲۲

۶۔ رسالہ چہار سو، قرۃ العین حیدر نمبر، جلد نمبر ۱۴، شمارہ جولائی - اگست ۲۰۱۵ء، ص: ۱۲

۷۔ پاکستان، قرۃ العین حیدر نمبر، ص: ۱۱۷، ۲۰۰۷ء، سید اختر حسین۔

۸۔ قرۃ العین حیدر، آخر شب کے ہم سفر، ص:۵۱، ۲۰۱۰ء ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۔
۹۔ قرۃ العین حیدر، آخر شب کے ہم سفر، ص:۵۱، ۲۰۱۰ء ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۔
۱۰۔ قرۃ العین حیدر شخصیت اور فن، ڈاکٹر صاحب علی، ص:۱۲۱، ۲۰۰۸ء شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی،
۱۱۔ آج کل، شمارہ نمبر ۴۰۰۔ ص:۲۵۰۔۲۵۱، ۲۰۰۷ء، انجمن ترقی اردو ہند
۱۲۔ قرۃ العین حیدر ایک مطالعہ، ارتضیٰ کریم، ص:۴۸۷، ۲۰۱۶ء روشان پرنٹرس دہلی۔۶

○○○

Address:
Dr.Hasina Khanam
Ibra Hostel,Near: Aisha Tarin School,Lal Diddi,Aligarh-202002 (U.P.)
Mob: +91 6307074632
Email: hasinakhanam2020@gmail.com